عائلی قوانین

سابقہ اشاعت میں ہم نے عائلی قوانین کے سلسلہ میں چند اشارات پیش کئے تھے اور کہا تھا کہ اس سلسلہ میں جو بحث ۱۹۶۱-۶۲ء میں چھڑی تھی ہم عندالضرورت اسے دوبارہ شائع کر دیں گے۔ اس ضمن میں ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس بحث کو اس اشاعت میں شائع کر دیا جائے۔ اس بحث کا پس منظر یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مروّجہ شخصی قوانین میں (جو صدیوں سے رائج چلے آ رہے ہیں) عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی جس قدر پامالی کی گئی ہے اس کے خلاف مسلسل احتجاج سے متاثر ہو کر، صدر محمد ایوب خان (مرحوم) نے ۱۹۶۱ء میں ایک آرڈی ننس کی رُو سے، ان میں کچھ ترمیمات کیں۔ یہ ترمیمات من و عن قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق تو نہیں تھیں لیکن مروّجہ قوانین کے مقابلہ میں بہرحال، منشاءِ قرآن سے زیادہ قریب تھیں اور ان سے کسی حد تک عورتوں اور یتیموں کے مظلوم طبقہ کی دادرسی ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت اسے کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کے حق میں ان کی طرف سے دلیل کیا دی جاتی تھی، وہ سننے کے قابل ہے۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے اس زمانے کے صدر اور ممتاز عالم مولانا محمد داؤد غزنوی (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے کہیں کہہ دیا کہ یہ (صدر مرحوم کے نافذ کردہ) عائلی قوانین ایسے نہیں کہ تمام کے تمام مسترد کر دیئے جائیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں جزئی ترمیمات کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس پر جماعتِ اسلامی کے ترجمان، 'ایشیا' نے اپنی ۲۰ راگست ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ان پر بڑی لے دے کی اور لکھا کہ:-

> مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے مولانا محمد داؤد غزنوی، امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنّت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو ـــــ وہ کسے باشد ـــــ حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ ضال اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور جس کی آڑ لے کر آج اسلام کا حلیہ، ترکی، مصر، انڈونیشیا، تیونس اور دوسرے ممالک میں بگاڑا جا رہا ہے اور پاکستان میں بھی اس کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اس نظریہ کے حق میں منکرینِ سنت بالکل وہی دلیل دیتے ہیں جو اہلِ حدیث مولانا غزنوی نے پیش فرمائی ہے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۳ء)

طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۶۲ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ان (عائلی) قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

اس میں انداز یہ اختیار کیا گیا تھا کہ ان معاملات کے متعلق پہلے قرآنی احکام درج کئے گئے تھے اور اس کے بعد عائلی قوانین۔ اور ان دونوں کے تقابل سے یہ واضح کیا گیا تھا کہ قوانین کسی حد تک قرآنی منشا کے مطابق ہیں اور ان میں کہاں کہاں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ مقالہ درج ذیل ہے۔

(۰)

عائلی قوانین

(قرآنِ کریم کی روشنی میں)

۱۔ نکاح

قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے جو اللہ تعالےٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے مِيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۲۱)۔ "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ، ان کی باہمی رضامندی سے بلا کسی قسم جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے "نکاح کی عمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

بلوغت

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (۴/۶)

(تم جب یتیموں کے سرپرست ہو تو) انہیں پرکھتے رہو تاآنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے: حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (۶/۱۵۳)۔ جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح

کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتا۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور اکیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳) "تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں"۔ اور عورتوں کے متعلق کہا کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹)۔ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں"۔

لہٰذا، جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی (سرپرست) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے، اس کی وضاحت مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (۴/۲۴) کہہ کر دی ہے۔ "مُحْصِنِيْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور مُسٰفِحِيْنَ سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا (۳۰/۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (۳۰/۲۱) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲/۲۲۱) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہوں، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲۱)۔

مروّجہ قانون

حالیہ نافذ کردہ عائلی قوانین کی رو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

---

[1] اس آیت میں جو ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ تو اس کا مفہوم "طلاق اور عدت" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

(ج) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا، اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲/۲۸۲)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حالیہ عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور مولوی صاحبان اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

۲۔ مہر

چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر، بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے "نِحْلَةً" کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶ (۴/۲۰))۔

(ج) مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے (۴/۴)۔

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اُسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (۲/۲۳۶)۔

مروّجہ قانون حالیہ عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی کے معاہدہ میں مہر کی ادائیگی کے طریقِ کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصوّر کیا جائے گا کہ وہ عند الطلب واجب الادا ہے۔ قرآنِ کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

۳۔ طلاق

طلاق کے معنی ہیں۔ "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ جب جی چاہے، اپنی مرضی سے اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النساء میں ہے:۔

> اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی

میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۲۵)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہوا المراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہوگی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہوگا۔

طلاق کے بارے میں حالیہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں، جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(ا) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد، اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(اا) چیئرمین، ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصوّر ہوگا۔

شق (ا) میں نقص یہ ہے کہ:۔

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلافِ قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ:۔

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ، طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی چیز ہے۔

(ب) دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہوا اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروّجہ قانون کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لیئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشأ کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہوگی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ:۔

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے۔ . . . . . .

شق (۱۱)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ (نوّے دن بطور عدّت رکھے گئے ہیں)۔

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہوگی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اُسی وقت سے شروع ہوگی۔

(ب) عدّت کی مدّت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدّت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں[1]

مولوی صاحبان کی طرف سے طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) مرد کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

(۲) اگر عورت گلو خلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو حق مہر چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

۴۔ طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد، عدّت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں تو آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔

---

[1] اب اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (۱۹۷۹ء)

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدّت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے، بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدّت کی مدّت کے بعد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کر لی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق، ان میں طلاق ہو گئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدّت کے دوران یا عدّت کے بعد، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی شادی ہو گی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے، نہ عدّت کے دوران، نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) "طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کر سکتے ہو" لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)۔

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، تین دفعہ (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ اس کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ یہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

(۰)

۵۔ تعدّدِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبّت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنّت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں، خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح، فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور کسی دوسری عورت (یا مرد) سے

شادی کر لی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ..... (۴/۲۰)
"اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے)۔ پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کر لو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، شادی کا اصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیش نظر، اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات اسلام کے ابتدائی دور میں، مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:-

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں، نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ ان کے علاوہ مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی۔ اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر، قرآن نے کہا کہ:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى .....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے ..... تو

عربی زبان میں "یتامیٰ" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآنِ کریم میں یَتَامَى النِّسَآءِ انہی معنوں میں آیا ہے۔ ۴/۱۲۷) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور ایک مرد۔ ایک عورت کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو، تین تین، چار چار تک
یعنی ایسی صورت میں "ایک بیوی" کے اصول میں استثناء کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اُس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی" کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹) ——— کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ ——— جو بیچاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بیکس اور لاوارث ہے ——— نہ اِدھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ:۔

(i) قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے، تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکتی، اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی عدم رضامندی سے دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآنِ کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آ جائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تاکہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہوگی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہوگی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے، یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرم ﷺ کے ایک ذاتی فیصلہ سے

بھی ثابت ہے۔

ایک دفعہ حضرت علی رضؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی کی۔ فرمایا۔ "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہوگی۔" چنانچہ حضرت علی رضؓ اس ارادے سے باز آگئے، اور حضرت فاطمہ رضؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی۔ جلد دوم صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا ہے اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہوگا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے، وہ رسول اللہؐ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائیگا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن کے حالات کے پیش نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ان میں مومن عورتیں، اپنے خانماں برباد، لاوارث، بے کس بہنوں کی امداد کے لئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہونگی (اور انہی جیسے حالات میں، مومن عورتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنونِ احسان ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزوِ خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں۔

(۰)

دوسری شادی کے لئے، قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ عدل۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصدِ اوّل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔

خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد، بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ) زندہ رہیں، حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال کی بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ اس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی — جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وہ وفات پا چکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہ رضؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔

چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:-

> محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔
>
> (MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواجِ مطہرات رضؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارک باد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں۔

(۰)

حالیہ عائلی قوانین

حالیہ عائلی قوانین میں اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لئے صرف پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شرط کا کوئی ذکر نہیں۔

لیکن ہمارے علماء حضرات پر اتنی سی شرط بھی سخت گراں گذر رہی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد کو بلا شرط حق حاصل ہے کہ جب چاہے چار تک بیویاں کر لے۔ اس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا! "شریعت" کے خلاف ہے۔ چار بیویوں کے علاوہ، وہ لونڈیوں کے رکھنے کا حق بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

۶۔ وراثت

حالیہ عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ:-

ہم نے اس جگہ اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی، روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا بنیادی معیار ہے۔

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہوں) بحصہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسبِ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی۔

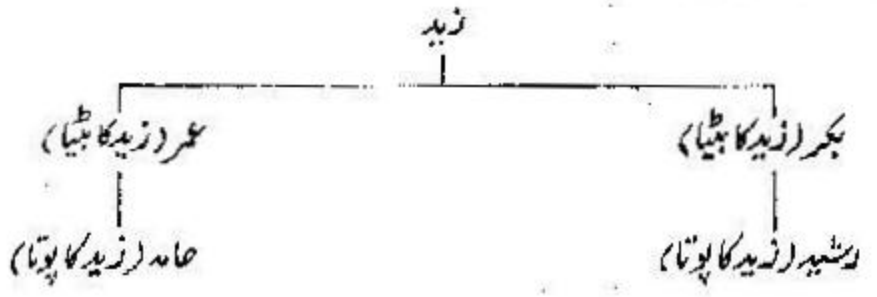

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہو گی تو، حضرات علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائداد عمر کو مل جائے گی۔ رشید اپنے دادا کی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے)۔ زید کی وفات پر، رشید کو وہی حصہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان اس کے بھی سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زید کے ترکہ سے اس کے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔

(۰)

اسمبلی میں پیش کردہ تحریک

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ عائلی قوانین میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی شق بھی قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ بعض شقوں کو قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق کرنے کے لئے کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے۔ لیکن اصولی طور پر ان میں کوئی بات قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ ان قوانین کی رُو سے، عورتوں اور یتیم اولاد کو وہ حقوق دلانے کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے جو قرآنِ کریم نے انہیں عطا کئے تھے لیکن جن سے انہیں، بدقسمتی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

لیکن قوم کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون۔ جولائی ۱۹۶۲ء) میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ قرار دیا جائے اور ان کی بجائے، وہی پرانے قوانین رائج کر دیئے جائیں جن کی رو سے:۔

(۱) والدین (یا دیگر سرپرست) نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی جس جگہ جی چاہے کر دیں۔

(۲) مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب جی چاہے، طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو الگ کر دے۔ لیکن اگر بیوی کی

کسی ظالم خاوند کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنا چاہئے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔

(۳) مرد کو حق حاصل ہو کہ جب چاہے، دو۔ تین۔ چار تک بیویاں کر لے۔ اور

(۴) یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم رکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ چاروں شقیں قرآنِ کریم کے احکام کے خلاف ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اب اصرار ہے کہ قانون یہی رائج ہونا چاہیئے۔ غنیمت ہے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی تحریک کا فیصلہ پہلے سیشن میں ہی نہیں ہو گیا۔ طے یہ پایا ہے کہ اسے پہلے "اسلامی مشاورتی کونسل" کی طرف بھیجا جائے۔

بدقسمتی سے ملک میں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے، اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح، دین و دانش، سب اس سیلاب کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اسے کوئی نہیں دیکھتا کہ، جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے وہ قرآنِ مجید کے بھی مطابق ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ دلیل کسی صورت میں بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ ہمارے لئے صحیح اور غلط کا اوّلین اور بنیادی معیار، خدا کی کتاب ہے۔ ہمیں تمام جذبات اور رجحانات سے الگ ہو کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں وہ کتاب ہمیں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ہم مرکزی مجلسِ قانون ساز اور (مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کے اراکین سے بالخصوص، اور ملک کے دوسرے سمجھنے سوچنے والے طبقہ سے بالعموم درخواست کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر از خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی سے متعلق کون سے قوانین، اسلام کے مطابق ہیں۔ اس ضمن میں اس بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھیئے (اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کا اس پر ایمان ہو گا) کہ:-

جو چیز قرآن کے خلاف ہو گی وہ کبھی اسلام کے مطابق
نہیں ہو سکتی۔

(ختم مقالہ ۱۹۶۲ء)

یہ (عائلی) قوانین اب تک رائج ہیں لیکن اب بڑی شدّت کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں، منسوخ کر دیا جائے۔ آہ بیچاری حوّا کی بیٹی! ؎

میری میناءِ غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی